Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے لگے تھے، اس جمعدار کے حکم پر اُسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ جب وہ دوسری بار دھاڑا تو اُس کی لمبی لمبی مونچھوں والے غضبناک چہرے کو دیکھ کر ہم نے بے چوں و چراں اپنے بکس اُٹھا کر کندھوں پر رکھ لئے۔ ہمیں پوری توقع تھی کہ اب وہ ایک اَور دھاڑ مارے گا اَور ہمیں دوڑ لگانے کا حکم دے گا۔ اِس خیال سے ہم نے پہلے ہی اپنی چلنے کی رفتار معمول سے تیز کر دی۔ جب اُس شخص کی جانب سے مزید کوئی گرج پیدا نہ ہوئی تو ہمارے دِل کو کچھ تسلی ہو گئی۔ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ آگے ہم نے ایک لڑکے کو اپنا راستہ کاٹ کر گزرتے ہُوئے دیکھا۔ فاصلے سے یہ وہی لڑکا دکھائی دیا جس نے آتے ہی ہمیں اپنا سامان سر پہ اٹھوایا تھا۔ نزدیک آنے پر وہ کوئی اَور لڑکا نِکلا، جو اپنی حجامت اَور اِستری شدہ پتلون اَور چمکتے ہُوئے سیاہ بوٹوں سے عین اُس پہلے لڑکے کی کاپی معلوم ہوتا تھا، اَور اُس نے حرکت بھی ویسی ہی کی۔ وہ چستی سے چلتا ہُوا کہیں جا رہا تھا، ہمیں دیکھ کر رک گیا۔ جیسے ہی اُس کے قریب پہنچے وہ چِلّا کر بولا،

"ڈبل اپ، یو لیزی کریچرز۔ ڈبل اپ۔"

ہم نے سمجھ رکھا تھا کہ اب ہم گل نواز کی ماتحتی میں ہیں اَور مزید خطرات سے محفوظ ہیں۔ ہم نے گویا مدد کے لِئے گل نواز کی جانب دیکھا۔ اُسی وقت گل نواز مُنہ کھول کر اپنی گرجدار آواز میں چیخا، "ڈبل اَپ،" جیسے کہ اُس لڑکے کی نقالی کر رہا ہو۔ حکم دے کر وہ خُود بھی سَاتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ ہمارے پاس اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اُس کے سَاتھ الٹے سیدھے قدم ملا کر دوڑنے لگیں۔

ہماری یہ دوڑ ایک عمارت اور دو کھیل کے میدانوں کو پار کرنے کے بعد ہمارے کمروں پہ آ کر ختم ہُوئی جو کم و بیش تین سو گز کے فاصلے پر تھے۔ ہمیں اپنے اپنے کمرے دِکھا کر گل نواز نے کُتّے کی بھُونک کی مانند آخری بار مُنہ کھولا۔

"ڈِنر سیون پی۔ ایم شارپ۔ طارق کمپنی مینُس اِز دیئر،" اُس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔

کمروں میں داخل ہو کر ہم نے اپنے بکس یوں زمین پہ پھینکے جیسے کِسی مردہ جانور کو پیٹھ پر لاد کر لائے ہُوں۔ اب ہمیں معلوم ہو چُکا تھا کہ افسر بننا رہا ایک طرف، ہم تو یہاں پہ سپاہی سے لے کر اُوپر تک ہر ایک کے ماتحت تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ اپنی سانس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

برابر کریں، جو اس قدر پھول گئی تھی کہ چھاتی کے اَندر دم ختم ہو چُکا تھا۔ دُوسرا مینُس تک پہنچنے کا مسئلہ تھا جو میدانوں کے پار بائیں طرف واقع تھا۔ راستے میں ایک لمبی عمارت آتی تھی جس کے برآمدے میں چند لڑکے کھڑے تھے۔ یہ ہو بہو اُسی قسم کے نوجوان تھے جنہوں نے ہمیں حکم دے کر دوڑنے کی سزا دی تھی۔ اگر قد کے اِنچ دو اِنچ فرق کو نظرانداز کر دیا جاتا تو لگتا تھا کہ سب ایک ہی سانچے سے ڈھل کر نِکلے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر ہماری رہی سہی جان بھی نِکل گئی۔ ہم نے اپنے کمروں کے دروازے بند کئے اَور بستروں پہ ڈھے گئے۔ ہمارے پاس صِرف ایک گھنٹے کا وقت تھا۔

بیس منٹ کے بعد کِسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں مُردے کی طرح بستر سے اٹھا۔ میرا ایک ساتھی آصف کھڑا تھا۔ وہ اَندر آ کر سیدھا بستر پہ بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اُس نے خاموشی سے قمیض کے دو بٹن کھولے اَور کالر کھینچ کر مجھ اپنا کندھا دکھایا۔ اُس کی گردن سے لے کر شانے تک ایک انتہائی خوفناک قسم کی خراش کا نشان تھا، جس پہ خُون کے باریک قطرے جمے ہُوئے تھے۔

"یہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے اٹیچی کیس کے بکسوئے نے کاٹ دیا ہے،" وہ بولا۔ "تم دکھاؤ۔"

گو میرے شانے پہ بھی مستقل درد اُٹھ رہا تھا مگر تھکاوٹ کے مارے میں نے اِس کی جانب دھیان نہ دیا تھا۔ میں نے بٹن کھولے اَور گردن موڑ کر دیکھا۔ میرا شانہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔

"بچ گئے ہو،" آصف نے دیکھ کر کہا۔ "میں نے جلدی میں بکسوئے والا حصہ کندھے پر رکھ لیا تھا۔"

"تُمہیں اِس پر ڈریسنگ کرنی چاہئے،" میں نے کہا۔ "خُون نِکل رہا ہے۔ زخم بن جائے گا۔"

"چھوڑ یار۔ میں ابھی صابن سے دھو لیتا ہُوں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے تو پیٹ میں بھوک سے درد ہونے لگا ہے۔ اب تُم تیار ہو جاؤ۔" یہ کہہ کہ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے اپنے بکس سے دُھلے ہُوئے کپڑے نکال کر بستر پہ پھیلائے۔ ٹھونس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھونس کر بھرے ہُوئے کپڑوں میں گہری شکنیں پڑ گئی تھیں۔ ہاتھوں سے دبا دبا کر میں نے شکنوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ جب کامیابی نہ ہُوئی تو پتلون، سویٹر اَور ٹائی کو حتی الوسع ہموار کر کے اُوپر بھاری بکس رکھ دیا۔ پھر میں نے جلدی سے غسل شروع کیا۔ غسل خانے کے شیشے میں اپنی خراش کی پُوری لمبائی کو میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ گردن سے لے کر کندھے کے نیچے تک رگڑ کھا کھا کر جلد اِس قدر سرخ اَور اُبھری ہُوئی تھی جیسے ابھی اُچھل کر باہر نِکل آئے گی۔ میں نے غسل کر کے صاف کپڑے پہنے۔ کپڑوں کی شکنیں اُسی طرح نمایاں تھیں۔ اب ہمارے پاس صِرف پندرہ منٹ تھے اَور ہم سب تیار ہو کر ایک ساتھ برآمدے میں کھڑے دُور سے اپنے میس اَور راستے میں پڑتی ہُوئی عمارت کو دیکھ رہے تھے۔ اب اُن کمروں کے باہر صِرف دو لڑکے کھڑے باتیں کر رہے تھے، مگر ہمیں پتا چل چُکا تھا کہ ہم سب کے لِئے صِرف ایک لڑکا ہی کافی سے زیادہ ثابت ہو سکتا تھا۔

"یار ایک تو انگریزی بول بول کر میری زبان اکڑ گئی ہے۔" اشرف نے کہا۔

"این سی او بھی انگریزی بولتا ہے،" آصف متانت سے بولا، جیسے کوئی اہم خبر سُنا رہا ہو۔

"تم تو کچھ بولے ہی نہیں،" شوکت نے کہا۔

"میں نے کئی بار یس سر کہا تھا،" اشرف نے جواب دیا۔

"سینئر انڈر آفیسر سے میں نے ہی ایک سوال کیا تھا۔"

"کیا سوال تھا؟"

"اب یاد نہیں رہا۔"

"دوڑ دوڑ کر تُم ساروں کی مت ماری گئی ہے،" برکت بولا، جو اتھلیٹ رہا تھا اَور ہم سب سے زیادہ ہوش میں تھا۔

"وہ کیڈٹ کالجیئے جو دُوسری کمپنی میں گئے ہیں خُوب انگریزی بول رہے تھے،" اشرف رشک بھرے لہجے میں بولا۔

"اُن کی شکل صورت بھی انہی لوگوں کی طرح ہے،" آصف بولا۔

"اُن کالجوں سے یہ آدھے کیڈٹ تو بن کر ہی نِکلتے ہیں۔"

"یار کیا وقت ضائع کر رہے ہو،" برکت بولا، "دس منٹ رہ گئے ہیں۔ چلو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلیں۔"

"میرے ذہن میں ایک سکیم ہے،" آصف نے کہا۔ "پچھلی طرف سے نِکل جائیں۔"

"کیسے نِکل سکتے ہیں؟ اُدھر سے رستہ ہی بند ہے۔"

"ایک چھوٹا سا رستہ لیفٹ کو جاتا ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"اوپر آ کے دیکھو، یہاں سے نظر آتا ہے۔"

"ہے تو سہی۔ کِسی کمرے کو جاتا ہُوا لگتا ہے۔"

"چل کر دیکھ لیتے ہیں۔"

ہم سب اُوپر کو چل پڑے۔ راستہ کمرے کو ہی جاتا تھا، مگر کمرہ بیٹھک کی طرز کا تھا اَور خالی پڑا تھا۔ ہم اُس میں داخل ہو کر دُوسرے دروازے سے نِکلے تو پیچھے ایک باغیچہ تھا۔ پودوں کو پھلانگتے ہُوئے ہم آخر ایک تنگ سے پتھریلے راستے پر جا نِکلے جہاں سے میس کا راستہ صاف تھا۔ ہم نے سُکھ کا سانس لیا۔

میس کے دروازے پر چار لڑکے کھڑے تھے، جو چاروں کے چاروں جڑواں بھائی معلوم ہوتے تھے، گویا یہی لباس اور حجامت لِئے ماں کے پیٹ سے برآمد ہُوئے ہوں۔

"لک ایٹ دیئر ہیرکٹ،" ایک نے دُوسرے سے کہا۔ "اے، یُو،" وہ ہمیں مخاطب کر کے بولا، "کم ہیئر۔ یو کانٹ گو اِن دیئر وِد یور لانگ ہیئر۔ ڈونٹ یو ہیو اے برش؟"

"ڈپ یور ہیڈ اِن ہیر،" دُوسرے نے ایک پانی سے بھرے ہُوئے ٹب کی جانب اشارہ کر کے ہم سے کہا۔

ہم حیرت زدہ ہو کر کھڑے رہے، جیسے زمین نے ہمارے پاؤں جکڑ لِئے ہوں۔

"کم آن۔ کم آن،" پہلا بولا، "ڈو یو وانٹ یور ڈِنر آر ناٹ؟"

"یس،" برکت نے جواب دیا۔

"سر،" لڑکا چیخا۔

"سر،" برکت نے دُہرایا۔

"یو وانٹ یور ڈنر، یو ڈپ یور ہیڈ اِن ہیر اَینڈ ارینج یو ہیئر پراپرلی۔ آر نو ڈِنر۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گو بیک۔ گیٹ آؤٹ آف ہیئر۔"

ایک لحظے کے توقف کے بعد برکت آگے بڑھا۔ اُس نے ٹب کے دونوں کناروں پہ ہاتھ رکھے اور جھک کر اپنے بال پانی میں ڈبو دیئے۔

"ڈاؤن،" لڑکے نے حکم دیا۔

برکت نے کانوں تک سر کو پانی میں ڈبویا۔

"ناٹ ای نف۔ ڈاؤن۔ ڈاؤن،" لڑکا حکم صادر کرتا گیا۔ "ڈاؤن بوائے، ڈاؤن،" حتیٰ کہ برکت کی ناک پانی میں ڈوب گئی۔ چند سکینڈ تک وہ سانس روکے اُسی حالت میں ٹھہرا رہا، پھر اُس کا دم ختم ہوا تو اُس نے گھبرا کر سر پانی سے نکال لیا۔ وہ سر کو ہاتھوں میں تھامے جھکا جھکا برآمدے کی سیڑھیوں تک گیا اور بالوں سے ٹپکتا ہُوا پانی نچوڑنے لگا۔

"آرگنائز دیم،" دُوسرا لڑکا بھونکا۔

برکت نے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اُنہیں سنبھالا۔

"وِد یور پام، پریس دیم۔ ڈاؤن۔ ڈاؤن۔"

برکت دونوں ہتھیلیوں سے بالوں کو دبا دبا کر جماتا گیا حتیٰ کہ گیلے بال کھوپڑی کے ساتھ جُڑ گئے۔

"ناؤ یُو،" پہلے لڑکے نے اشرف سے کہا۔

ایک کے بعد ایک، ہم سب کو اِسی اذیت سے گزرنا پڑا۔ اُس کے بعد ہمیں میس میں جانے کی اجازت ملی۔ ہم ہال میں بچھی ہُوئی لمبی سی میز کے ایک کونے پر جا کر بیٹھ گئے۔ ہال میں دس بارہ ایک جیسے لڑکے دو ٹولیوں میں کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ ہمیں استہزائیہ نظروں سے دیکھتے اَور مسکرا کر مُنہ پھیر لیتے۔ اب صورت یہ تھی کہ اُس چمکتے ہُوئے صاف شفاف ہال اَور چست لباسوں والے لوگوں کے درمیان ہم چھ لڑکے اپنے ڈھیلے ڈھالے شِکنوں والے کپڑے پہنے، بالوں کو کھوپڑیوں پہ لیپ کئے جن سے پانی کے قطرے گر کر ہماری کالروں کو گیلا کر رہے تھے، میز کے آخر میں سمٹ کر بیٹھے تھے اَور کوئی بیرا ہماری جانب توجہ نہ دے رہا تھا۔ بھوک سے ہماری انتڑیاں کلبلا رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد پانچ چھ کیڈٹ کالجیئے لڑکے آ کر ہم سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ ان سب کے بال بھی گیلے تھے۔ مگر وہ ہماری طرح مصیبت زدہ دکھائی نہ دے رہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے بلکہ آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے، جیسے کہ اِس ساری کارروائی کو مذاق کی حد تک تصور کر رہے ہوں۔ ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم ساری رات وہاں بیٹھے رہیں گے اَور کوئی ہماری جانب توجہ نہ دے گا۔ آخر تقریباً پندرہ منٹ کے بعد، جو ہمیں پندرہ گھنٹے کے برابر لگے، بیرے کھانے لے کر آتے ہُوئے دکھائی دیئے۔ ایک اَور مسئلہ یہ تھا کہ چھری کانٹے کے ساتھ کھانا مطلوب تھا۔ جس کا سلیقہ ہم سب میں صِرف شعیب کو تھا۔

"میری طرف دیکھتے جاؤ،" وہ سرگوشی میں بولا۔ "جیسے میں کروں ویسے ہی کرتے جاؤ۔"

جیسے تیسے ہم نے کھانا ختم کیا۔ کیڈٹ کالجیئے اعتماد سے چھری کانٹا اِستعمال کر رہے تھے۔ ہمیں اُس رات کو ہی اُن سے حسد ہو گیا تھا، گو وقت گزرنے کے ساتھ اپنی ہڈم کے سب لڑکوں کی آپس میں دوستی اور ہمسری کی روایت قائم ہوتی گئی تھی۔ کھانا ختم کرتے ہی ہم اَیسے بے آواز اَنداز میں کرسیوں سے اُٹھے کہ ہال میں موجود کافی سارے لوگوں کو خبر نہ ہوئی۔ ہمارے دِلوں میں وسوسہ یوں گھر کر چُکا تھا کہ ہم کنکھیوں سے اپنے پیچھے دیکھتے ہوئے، ٹیڑھے ٹیڑھے چلتے ہُوئے وہاں سے نِکلے جیسے لوگ مقدس مزاروں سے پچھلے پاؤں نِکلتے ہیں۔ باہر آ کر ہم نے تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس بھر کر سینہ صاف کیا۔ اپنے تئیں ہم اب دِن بھر کی کارروائی سے عہدہ برا ہو چکے تھے۔ چنانچہ جس پچھلے راستے سے آئے تھے اُسے چھوڑ کر سیدھے رستے واپس ہو لئے۔

ابھی ہم چند ہی قدم گئے ہوں گے کہ ایک باوردی آدمی، جو شاید حوالدار یا جمعدار یا صوبیدار تھا، ایک دم کہیں سے اَیسے ظاہر ہوا جیسے کوئی جنگلی جانور کِسی جھاڑی کے عقب سے جست بھر کر نِکلتا ہے۔ نِکلتے ہی اُس کے حلق سے الفاظ اَیسی آواز میں برآمد ہوئے جیسے بارود کا گولہ پھٹتا ہے۔

"ڈبل اپ، یو لیزی بگرز۔ ڈبل اپ۔"

ہم اُچھل کر دوڑ پڑے، اَور دوڑتے دوڑتے اپنے کمروں میں جا کر رُکے۔ اُس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کب مَیں نے اُٹھ کر کپڑے بدلے اَور کب سویا۔ مگر اکیڈمی میں وہ پہلے دِن کا دِن مجھے عُمر بھر یاد رہے گا، جس کے دوران ہمیں علم ہوا تھا کہ وہاں پہ ہم، سپاہی سے لے کر اُوپر تک ہر ایک کے صِرف ماتحت ہی نہیں بلکہ زر خرید غلام تھے۔

اگلے روز نائی نے ہمارے سروں کے گرد بھی اونچی اونچی مشین پھیر کر گردن اَور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کان ننگے کر دیئے۔ پھر درزی نے ہماری وردیاں سینے کے لِئے ماپ لئے۔ اگلے ہی روز ہماری چست وردیاں سل کر آ گئیں۔ جب ہم نے وہ پہنیں اَور کالے بوٹ چڑھائے تو مُجھے محسوس ہوا کہ ہماری چال ہی بدل گئی ہے۔ سَاتھ اپنے بالوں کی کٹائی کی وجہ سے شکل بھی بدل چکی تھی۔ دو دِن میں ہی ہمارے اَندر اعتماد پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اُس وقت میرے اَندر یہ احساس پیدا ہُوا کہ انسانوں کو ایک منظّم گروہ، خواہ وہ کیسا ہی عجیب الخلق کیوں نہ ہو، اپنے ارکان کو کِس طرح شمولیت، تحفظ اَور قوت مہیا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ابھی ہمارا کورس شروع بھی نہ ہوا تھا۔

چوتھے روز جب کورس باقاعدہ طور پر شروع ہوا تو دِن بھر کا پروگرام دیا گیا، جو اس طرح تھا: صبح چھ سے سات پی۔ٹی۔ سات سے آٹھ پریڈ۔ پھر ایک گھنٹہ غسل، لباس بدلنے، اور ناشتہ کرنے کے لئے، جو پریڈ میدان سے کمرے، کمرے سے میس اَور میس سے کلاس روم کے درمیان دوڑ لگاتے لگاتے ہی گزر جاتا۔ نو سے گیارہ پڑھائی کی کلاسیں، جن میں ملٹری سیجیکٹ پڑھائے جاتے۔ بارہ بجے دوپہر کا کھانا، ایک سے دو بجے تک ریسٹ، دو سے چار پریڈ، چار سے چھ گیمز، سات بجے ڈنر، ڈنر کے بعد ایک دو گھنٹے پڑھائی کے لِئے اَور پھر لائٹ آف۔ کہنے کو دِن کے دَوران ریسٹ کے تین گھنٹے تھے، مگر کمرے میں جاتے جاتے جو کوئی چھوٹا بڑا مل جاتا، یا دور سے دیکھ ہی لیتا، وہیں پہ پکڑ لیتا اَور وہ جو کچھ کرنے کو کہتا وہی کرنا پڑتا۔ کِسی سوال جواب کی گنجائش نہ تھی۔

جس روز اشرف کا نام شرفی بکرا اَور برکت کا برکی نیولا رکھا گیا اُس دِن ہم اپنے کمروں کو جاتے ہُوئے ابھی کچھ دور ہی تھے کہ دُوسری ٹرم کے کیڈٹ مجید اللہ نے ہمیں دیکھ لیا۔

"یو،" وہ بولا، "نِیل ڈاؤن۔ آل آف یُو۔"

ہم کھڑے کھڑے جُھکے تو وہ بولا، "ناٹ لائیک دِس۔ لائک اے فراگ۔ کم آن، اے فراگ، اے فراگ، لائیک اے فراگ۔"

ہم نے ہاتھوں اَور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر مینڈک کی شکل اختیار کر لی۔

"ناؤ فراگ مارچ ٹو یور روم۔ گو آن۔ کوئک۔ فراگ مارچ۔"

ہم مینڈک کی طرح پھُدک پھُدک کر چلتے ہُوئے اپنے کمروں تک آئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"واٹ آر یُو کالڈ؟" مجید اللہ نے اشرف سے پوچھا۔

"اشرف سر۔"

"آئی وِل کال یُو شرفی۔"

"یس سر۔"

"ناؤ امیجن دَیٹ یو آر اے گوٹ۔"

"یس سر۔"

"گو آن۔ سپیک لائیک اے گوٹ۔" اشرف نے میں اَیں اَیں کر کے بکرے کی مانند آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔

"اینڈ یُو؟" مجید اللہ نے برکت سے پوچھا۔

"برکت سر۔"

"بلڈی پیزنٹ نیم۔ فرام ٹوڈے یُو آر برکی، اَینڈ یو لُک لائیک اے مانگوس۔"

"یس سر۔"

"یو نو ہاؤ ڈز اے مانگوس سپیک؟"

"یس سر۔" یہ کہہ کر برکت نے چرر چرر کی آواز پیدا کی۔

"گو آن، گو آن۔"

برکت نے چرر چرر کی گردان شروع کر دی۔

"آل رائٹ، سٹاپ۔" مجید اللہ اشرف کی جانب انگلی اٹھا کر بولا، "اَینی ٹائم یُو سی می، یُو سٹارٹ سپیکنگ ایز اے گوٹ۔ اَینڈ یُو،" وہ برکت سے مخاطب ہوا، "آلویز سپیک لائیک اے مانگوس یُو انڈر سٹینڈ؟"

"یس سر،" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"اِف یُو فورگیٹ، یو شیل بھی پنشڈ۔ او کے؟"

"یس سر۔"

پنشمنٹ سے ہماری جان جاتی تھی۔ اگر کوئی سینئر پریڈ سے واپسی پر ہمیں دیکھ لیتا اَور اُسے سزا دینے کی سوجھتی تو وہ کِٹ سمیت ہمیں روک کر ڈبل آپ کرا دیتا اَور خُود کھڑا دیکھتا رہتا۔ یوں ہمارا ریسٹ کا گھنٹہ گراؤنڈ میں دوڑتے ہُوئے گزر جاتا۔ جب تک کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہماری ٹانگیں یا پھیپھڑے جواب نہ دے جاتے۔ حکم عدولی نام کی کوئی چیز یہاں پہ تھی ہی نہیں۔

اُس دِن کے بعد شرفی بکرا اَور برکی نیولا کا نام اُن دونوں کے ساتھ یوں نتھی ہوا کہ عمر بھر چپکا رہا۔ کچھ عرصے تک مجید اللہ کا دستور بن گیا کہ وہ بغیر پوچھے کچھے ہمارے کمروں کے دروازے کھول کر اَندر گھس آتا۔ شرفی اُسے دیکھتے ہی بکرے کی مانند میں اَیں اَیں کرنے لگتا اَور برکت کے کمرے میں برکی نیولے کی طرح چرر چرر شروع کر دیتا۔ پھر ایک بار یہ تماشا مجید اللہ پہ اُلٹ پڑ گیا۔ وہ برکت کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر داخل ہوا تو اتفاق سے شرفی بھی وہاں بیٹھا تھا۔ مجید اللہ کی شکل دیکھتے ہی برکی اُچک کر اپنے بستر پہ چڑھ کر کھڑا ہو گیا اَور چرر چرر کرنے لگا۔ اُس کے ساتھ ہی شرفی نے اُٹھ کر میں ایں ایں کی رٹ لگا دی۔ مگر مجید اللہ اکیلا نہ تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے سینیئر انڈر آفیسر صبغت اللہ تھا جو کمروں کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ اَندر داخل ہوا تو چند لمحوں تک آنکھیں پھاڑے دونوں لڑکوں کو یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مجید اللہ نے ہاتھ اُٹھا کر اُنہیں خاموش کرایا۔

"واٹ اِز گوئنگ آن؟" سینئر انڈر آفیسر نے مجید اللہ سے پوچھا۔

"سر دِیز فرسٹ ٹرمرز آر اِن دی ہیبِٹ آف ڈوَینگ دِس،" مجید اللہ شرمندہ سا ہو کر بولا۔

سینیئر انڈر آفیسر نے سنجیدگی سے کمرے کی اِنسپکشن کی اَور دونوں کمرے سے نِکل گئے۔ اُس دِن کے بعد مجید اللہ نے شرفی اَور برکی کو منع کر دیا۔

شرفی کو سب سے زیادہ سزا ملتی تھی۔ وہ سخت مسخرہ آدمی تھا اَور کِسی موقعہ پر بھی شرارت سے باز نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ہم سب کو مشکل میں ڈال دیتا تھا۔ ایک بار ہم فلم شو دیکھ رہے تھے۔ کوئی پُرانی سی امریکی فلم تھی جس میں بیسیوں عورتیں نہانے کا مختصر لباس پہنے اِدھر اُدھر چلتی پھرتی اَور سوئمنگ کرتی دکھائی گئی تھیں۔ ایک سین میں انہی لڑکیوں کا کورس ڈانس آیا تو شرفی نے سیٹی بجا دی۔ یہ بات ڈسپلن کے خلاف تھی، خاص طور پہ سینیئرز کی موجودگی میں یہ حرکت قابل سزا تصور کی جاتی تھی۔ سیٹی کی آواز پہ سینیئرز نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہم سے اگلی قطار والوں کو پتا چل گیا تھا کہ سیٹی شرفی کے مُنہ سے نِکلی تھی۔ ہمیں علم تھا کہ فلم کے اختتام پر وہیں پہ انکوائری ہو گی اَور شرفی کی شامت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آ جائے گی۔ میں نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ ہمارا چھ کا گروپ ساتھ ساتھ بیٹھا تھا۔ سب نے اُسی طرح سیٹیاں بجانی شروع کر دیں، جو سیدھی سادھی سیٹیاں نہ تھیں بلکہ اُن میں "شی" کی آواز شامل تھی۔ ہمارے ساتھ ہی صلاح الدین کمپنی والے کیڈٹ کالجیئے بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے اُس وقت ہمارا ساتھ دیا۔ اب صورت یہ تھی کہ سکرین پر ننگی ٹانگوں والی لڑکیوں کا کورس ڈانس ہو رہا تھا اور ہماری تقریباً ساری قطار سیٹیاں بجا رہی تھی۔ گو یہ تماشا صِرف چند سیکنڈ رہا، مگر سامعین میں کھلبلی مچ گئی۔ سینئرز غصے سے مڑمڑ کر دیکھ رہے تھے۔ باقی کی فلم خاموشی سے دیکھی گئی۔ جیسے ہی لوگ فِلم دیکھ کر اُٹھے، ہماری قطار کو فال اِن کرا لیا گیا۔

"ہُوو ہسلڈ؟" سینئر انڈر آفیسر نے سوال کیا۔

کسی نے جواب نہ دیا۔

"آئی سے ہو دی بگر وہسلڈ فرسٹ؟ سپیک۔"

سب خاموش کھڑے اپنے اپنے سامنے دیکھتے رہے۔ ہم پنشمنٹ کے لِئے تیار تھے۔

"آل رائٹ یُو آل۔ یُوِل ناٹ واک نو یُور رُومز۔ نیدر رِل یُو رن۔ یُو ولِ گو نو یور رُومز سمر سالٹنگ فرام ہیئر۔ ناٹ آن یور ہینڈز بٹ آن یور ہیڈز۔ یو انڈر سٹینڈ واٹ دیٹ از؟"

"یس سر۔"

"ڈِسکرائیب اِٹ۔"

"قلابازیاں سر۔"

"رائٹ۔ سٹارٹ،" وہ بولا، پھر ایک دم چیخا۔ "ناؤ!"

فلم شو اوپن ایئر میں ہوا تھا۔ اُس سے پہلے بارش ہو کے ہٹی تھی۔ ہماری قطار کی قطار کیچڑ، پتھروں اور گیلی زمین پر قلابازیاں کھانے لگی۔ رستہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ آخر آدھ گھنٹے کے بعد ہم اپنے کمروں تک پہنچے۔ ہماری حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ سر، ہاتھ، مُنہ اور کپڑے مٹی اور کیچڑ میں لت پت تھے۔ کئی کے ماتھوں پر خراشیں آ گئی تھیں۔ وہ شام تو ہم سب نے غسل خانوں میں اپنی مٹی اتارتے ہُوئے گزاری۔ اگلا سارا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دِن ہم شرفی کے خلاف سکیمیں بناتے رہے۔ شرفی نے اُن سب کو جنہوں نے چہرے اَور ہاتھوں کی خراشوں پہ پلستر چپکا رکھے تھے "سوری" کہا، مگر کسی نے جواب نہ دیا اَور نہ اُس سے بات کی۔ رات کے کھانے کے بعد پڑھائی کے گھنٹے میں ہم سب دبے پاؤں شرفی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ صلاح الدین کمپنی والے کیڈٹ کالیجئے بھی چھپ کر آ گئے۔ سب سے پہلے ہم نے شرفی کے کپڑے اُتارے اَور صِرف انڈرویئر میں اُسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ شرفی نے ذرا برابر مزاحمت نہ کی، جیسے بکرا رضامندی سے قربانی کو جا رہا ہو۔ پھر دو لڑکوں نے پکڑ کر اُسے سر کے بل کھڑا کر دیا۔ اُس کی پشت اَور ٹانگیں لڑکوں نے دیوار کے ساتھ دبا کے رکھیں۔ باقی کے سب کرسی، میز، بستر اَور زمین پہ اطمینان سے بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ باتیں کرنے یا کوئی بھی آواز پیدا کرنے کا موقع نہ تھا۔ کمرے میں چاروں طرف بیٹھے ہُوئے ہم لوگ سب یوں اِنہماک سے دیکھ رہے تھے جیسے کلاس میں بیٹھے ہُوئے سنجیدگی سے بلیک بورڈ کو دیکھ رہے ہُوں۔ جب شرفی کا مُنہ بیربہوٹی کی مانند لال ہو گیا تو ایک منٹ کے لِئے اُسے سیدھا کھڑا کیا گیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ ذرا صاف ہی ہوا تھا کہ دوبارہ اُسے اُلٹا کر دیا گیا۔ چند مرتبہ اُلٹا سیدھا کرتے ہوئے دس منٹ گزر گئے۔ آخری مرتبہ اُسے کئی منٹ تک الٹا رکھنے کے بعد جب شرفی کی آنکھیں اُبل پڑیں تو سب نے ایک دُوسرے کی جانب دیکھ کر خاموشی سے اثبات میں سر ہلائے اَور اس متفقہ فیصلے کی بنا پر شرفی کو سیدھا کھڑا کر دیا۔ ابھی اُس کی سانس برابر نہ ہُوئی تھی کہ اُسے بازوؤں سے پکڑ کر غسل خانے میں لے جایا گیا، جہاں سرد پانی کی بھرئی ہُوئی بالٹی تیار رکھی تھی۔ اُسے اٹھا کر شرفی کے سر پہ اُنڈیل دیا گیا۔ پھر کیڈٹ کالجیئے، جمال نے اپنے بیگ سے ایک پلاسٹک کا ڈبہ نکالا جو عموماً کھانے لے جانے کے لِئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جمال نے اُس کا ڈھکنا کھولا تو ڈبہ کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اُس گروپ کے درمیان طے تھا کہ جمال نے کیچڑ جمع کرتے ہُوئے ہاتھ گندے کئے تھے، چنانچہ اسے استعمال کرنے کا کام دُوسرے کریں گے۔ دو لڑکوں نے چلو بھر بھر کر کیچڑ شرفی کے سر اور بالوں پہ مل مل کر لیپ کر دیا۔ اِس عمل کے دوران شرفی نے مُنہ اَور آنکھیں دبا کر بھینچ لیں، مگر شروع سے آخر تک اُس کے مُنہ سے آواز تک نہ نِکلی۔ جب کیچڑ ختم ہو گیا تو دونوں لڑکوں نے ہاتھ دھو کر خشک کئے۔ پھر ہم سب جیسے آئے تھے اُسی طرح خاموشی سے ایک دُوسرے کے پیچھے اُس کمرے سے نِکل کر اپنے کمروں میں چلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے۔ اُس دِن کے بعد سے کیڈٹ کالجیوں کے ساتھ ہمارا ایکا ہو گیا۔

اِسی طرح جانیں مارتے، سختیاں سہتے، سزائیں بھگتتے ہُوئے خُدا خُدا کر کے، پہلی ٹرم ختم ہوئی اَور ہم سینیئرز میں شامل ہو گئے۔ عجیب بات تھی کہ فرسٹ ٹرم کے آخری دنوں میں ہمارے دلوں کے اَندر اُس بدسلوکی کے بارے میں جو ہمارے ساتھ روا رکھی گئی تھی کوئی کدورت باقی نہ رہی تھی، بلکہ ہمارے خیال کے مطابق اُس کے ذریعے ہمیں یہ حق دے دیا گیا تھا کہ نئے فرسٹ ٹرمرز کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں جیسا ہمارے ساتھ کیا گیا تھا۔ دستور کے مطابق ہم نے وَیسا ہی کیا۔ اِس ٹرم میں کُچھ شارٹ سروس کورس کے لڑکے بھی آئے تھے، جن کی خاص طور پر کھچائی کی گئی، کیونکہ ہمیں عِلم تھا کہ یہ لڑکے آٹھ نو ماہ میں ہی افسر بن جائیں گے جبکہ ہم لوگ ابھی تھرڈ ٹرم میں گھسٹ رہے ہوں گے۔ ہم اُن سے حسد بھی محسوس کرتے تھے، اَور ساتھ ہی اپنے آپ کو "پروفیشنل سولجرز" ہونے کی حیثیت سے اُن کے مقابلے میں اعلیٰ تر تصور کرتے تھے۔ اِن سب باتوں سے قطع نظر ہمارا روزانہ کا پروگرام وَیسا کا وَیسا ہی رہا، پہلی ٹرم کے مقابلے میں یہ دُوسری اکیڈیمک ٹرم تھی، جس کی کلاسوں میں بی۔ اے کے کورس کے مضامین پڑھائے جاتے تھے اَور اُسی حساب سے رات کے دو گھنٹے کی پڑھائی میں بھی محنت درکار تھی۔ اگرچہ پہلی ٹرم کی مشقت کے بعد ہماری جسمانی صحت کافی بہتر ہو چکی تھی، مگر دِن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد تھکاوٹ اب بھی ہم پہ اِس طرح نازل ہوتی تھی کہ نو بجے کے بعد آنکھیں کھلی رکھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ دِن والے ریسٹ کے ایک دو گھنٹے بھی پڑھائی کی نذر ہو جاتے تھے۔ اکیڈمی میں دِن کانے نہ کٹتا تھا، مگر ہفتے اَور مہینے یوں گزرتے تھے جیسے گھڑیاں اَور گھنٹے ہُوں۔ میرے اکیڈیمک رِزلٹ اَور دیگر کارکردگی کی بنا پر تیسری ٹرم میں مجھے پلاٹون کارپورل بنا دیا گیا تھا، جس کی وجہ سے میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ فیلڈ کے فرائض کے علاوہ چھوٹے موٹے ڈِسپلن کے معاملے بھی میرے زیرِ نگرانی آ گئے تھے۔ اب ہم سزائیں بھگتنے اور سزائیں دینے کے کھیل کی منزلوں سے گزر کر اصل ذمہ داری سنبھالنے کی حیثیت میں آ چکے تھے۔ اِس تجربے سے مُجھے پتا چلا کہ ہاں یا نہ میں فیصلہ صادر کرنے کے اختیار کا بوجھ کِس قدر وزن دار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ مجھے اپنی تمام تر ٹریننگ اَور اصولوں سے بہ رضا منحرف ہونا پڑا تھا۔ ایک بار ایک شارٹ سروس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمیشن والے لڑکے کا، جنہیں ہم آپس میں "شارٹیئے" کہتے تھے، کیس آ گیا، جس نے ہینڈ ٹو ہینڈ فائٹینگ کی ٹریننگ کے دوران اپنی بیونٹ گم کر دی تھی۔ ہتھیار گم کرنا ایک مِس ڈیمیز تصور ہوتا تھا۔ اِس لڑکے کے ساتھ میری ہمدردی کچھ اِس وجہ سے بھی تھی کہ اپنی جسمانی ساخت کے باعث، جو بھاری کولہوں، نمایاں تھنوں اور لچک دار چال والی تھی، اسے عرف عام میں زنخا کہا جاتا تھا اور شدید قسم کی کھچائی کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ مگر دماغی طور پر یہ لڑکا انتہائی ذہین تھا۔ جب وہ میرے پاس آیا تو قاعدے سے میں نے اُسے مطلع کر دیا کہ ہتھیار گم کرنا ایک اہم معاملہ تھا اور انکوائری کے بغیر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب میں نے دوبارہ اُس کی شکل دیکھی تو ایک لحظے کے لِئے پریشان ہو گیا۔ اُس کا رنگ سرسوں کی مانند زرد اور آنکھوں میں حیوانی وحشت کا اثر تھا۔

"سر، مجھے نکال دیا جائے گا" وہ کانپتی ہُوئی آواز میں بولا۔ خوف کی وجہ سے وہ انگریزی میں بات کرنا بھی بھول گیا تھا۔

"یُو ولِ ناٹ بھی تھرون آوَٹ،" میں نے کہا۔ "اونلی پنشڈ۔"

"نو سر،" وہ نفی میں سر ہلا کر بولا، "آئی وِل بی تھرون آوَٹ۔ آئی وِل بی ڈیسٹرآئیڈ۔" اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کانپ رہا تھا۔

"آل رائٹ،" میں نے اِس کی حالت دیکھ کر کہا۔ "ویٹ۔"

"آئی کم فرام اے پوئر فیملی سر۔"

"ویٹ۔ ویٹ۔"

میں نے جلدی سے فیصلہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح اُسے بچانا ہی پڑے گا، ورنہ وہ نفسیاتی طور پہ تباہ ہو جائے گا۔ ایک ہی طریقہ تھا کہ میں جھوٹ بول کر ذِمہ داری اپنے سر لے لوں۔ میں نے پلاٹون سارجنٹ کے پاس جا کر سارا معاملہ صاف صاف بتا دیا۔ اُس نے مجھے نتائج کے بارے میں خبردار کیا، مگر میں نے اُسے قائل کر لیا کہ میں ساری ذِمہ داری قبول کرتا ہُوں۔ جب پلاٹون کمانڈر کے سامنے پیشی ہُوئی تو میں اپنی "سٹوری" بنا چُکا تھا۔ کیپٹن اسد اللہ پلاٹون کمانڈر کو میں نے بیان دیا کہ کیڈٹ نواز کھوکھر ہینڈ ٹُو ہینڈ ایکسرسائیز سے واپس آ رہا تھا تو میں اُس کی بیونٹ اُتار کر اس کا معائینہ کرنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے بیونٹ میرے ہاتھ سے پھسل کر کھڈ میں جا گری۔ میں نے رسوں کی مدد سے لڑکے کھڈ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُتارے، مگر بیونٹ نہ مل سکی۔ کیپٹن اسد اللہ نے مجھ سے چند مزید سوالات کئے، پھر بولا، "آئی کین ریلیگیٹ یُو،" وہ کڑی نظروں سے مجھے دیکھنے اور سوچنے کے لئے رُکا۔ "بٹ آئی وِل لیٹ یُو آف دِس ٹائم۔ کیپ یور وِٹس اباؤٹ یُو، اَینڈ،" وہ سختی سے بولا، "فائنڈ دا بلڈی وَیپن۔"

معاملہ ختم ہوگیا۔ ہم گمشدہ بیونٹ کو بھول چکے تھے کہ چار پانچ ماہ کے بعد ایک روز ایک این۔ سی۔ او اُسے ہاتھ میں اٹھائے ہُوئے آیا۔ پتا چلا کہ بیونٹ ڈمی کے پیٹ میں گھاس، پھونس، روئی اور مرغابی کے پیروں کے اندر ہی پھنس کر رہ گئی تھی اور کیڈٹ کو غالباً ہینڈ ٹو ہینڈ کی ہاؤ ہو اور جوش و خروش میں دیر تک اس کی خبر ہی نہ ہُوئی تھی۔ اتفاق سے ایک اور ایکسرسائیز کے دوران ایک لڑکے کی بیونٹ ڈمی کے اندر کِسی لوہے سے ٹکرائی تو اُسے شک ہوا، اور تلاش کرنے پر گمشدہ بیونٹ نِکل آئی۔ ہم نے چپکے سے بیونٹ واپس کر دی۔ اُس وقت تک اُسے گم کرنے والا کیڈٹ اکیڈمی سے فارغ ہو کر جا بھی چُکا تھا۔

اِسی طرح ایک اور موقع پر کیڈٹ حبیب اللہ ایک رات کو بارہ بجے باہر سے واپس آیا تو گیٹ پر روک لیا گیا۔ یہ کیڈٹ چارسدے کا خوش شکل پٹھان تھا، اور افواہیں تھیں کہ ایک سول کے افسر کی بیوی کے ساتھ اُس کے تعلقات تھے۔ گیٹ بند ہونے کے بعد باہر رہنا بڑا جرم تھا، اور حبیب اللہ کے کیس کی انکوائری کے دوران یہ معاملہ ایک "مورل ٹرپی ٹیوڈ" کی شکل اختیار کر سکتا تھا۔ جس کے تحت اُسے سروس سے نکالا بھی جا سکتا تھا۔ میں اُس وقت حبیب اللہ کا پلاٹون سارجنٹ تھا۔ مجھے بارہ بجے سوتے سے اُٹھا کر اطلاع دی گئی۔ میں نے جلدی سے کپڑے پہنے اور گیٹ پہ پہنچا۔ حبیب اللہ کا چہرہ نچڑا ہُوا تھا۔ میں نے الگ لے جا کر اُس سے پوچھا تو اُس نے سچ سچ بتا دیا کہ وہ ایبٹ آباد گیا تھا اور واپسی پہ اُسے دیر ہوگئی۔ معاملے کی نزاکت کے پیش نظر میں نے یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ کیوں اور کِس سلسلے میں وہاں سے دیر کر کے آیا تھا۔ حبیب اللہ کی نگاہوں میں شرمندگی تھی۔ مگر وہ اِتنا بااصول اور اَپ رائٹ قسم کا شخص تھا کہ اگر میں اُس سے سوال بھی کر دیتا تو وہ ساری کہانی بیان کر دیتا، جسے میں سننا نہ چاہتا تھا۔ مَیں نے گیٹ والوں سے کہا کہ ہمارا ایک کیڈٹ بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں داخل تھا، اور حبیب اللہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو میں نے اُس کی خبر گیری کے واسطے بھیجا تھا جہاں پہ اُسے دیر ہو گئی۔

حبیب اللہ آخر تک میرا وفادار رہا۔ میں جہاں بھی پوسٹنگ پر گیا اُس نے ٹیلیفون یا خط کے ذریعے میری خیریت دریافت کی۔ وہ کمیشن پانے کے ایک سال کے اندر ہی کشمیر میں لائن آف کنٹرول پر دشمن کے ساتھ ایک جھڑپ کے دوران شدید زخمی ہو گیا اور چند روز ہسپتال میں رہنے کے بعد فوت ہو گیا۔ مَیں اُس کا فاتحہ پڑھنے کے لِئے راہوالی سے، جہاں میں اُس وقت پوسٹنگ پہ تھا، چار سدہ گیا تھا۔

اکیڈمی کے دو سال گویا آنکھ جھپکتے میں گزر گئے۔ ہمارے سامنے کئی گروپ بنے اور ٹوٹے، مگر ہم چھ لڑکے جو پہلے روز اکٹھے آئے تھے، سارے خُدا کے فضل سے ایک ساتھ رہے۔ یوں تو ہم چھ کے چھ آپس میں پکے دوست تھے، مگر میری قربت سب سے زیادہ شعیب کے ساتھ تھی۔ میں چھٹیوں میں ایک دو بار اُس کے گھر بھی جا چُکا تھا۔ یہ لوگ چھاؤنی کے علاقے میں رہتے تھے۔ شعیب کا باپ ریٹائرڈ بریگیڈیئر اور بلند بانگ قسم کا آدمی تھا۔ شعیب کی ایک بہن نسیمہ تھی جس نے ابھی ابھی بی۔اے کیا تھا اور ایم۔اے سائیکالوجی میں داخلہ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ پہلی بار میں گاؤں جاتے ہوئے صِرف ایک گھنٹہ اُن کے ہاں رُکا تھا، جس کے دوران بریگیڈیئر صاحب اور شعیب کی بہن سے صِرف علیک سلیک ہُوئی تھی۔ دُوسری بار شعیب نے اصرار کرکے مجُھے ایک رات کے لِئے ٹھہرا لیا۔ اُس شام کو ہم کھانے کی میز پہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اُن کی ماں کہیں دکھائی نہ دی، نہ ہی کِسی نے اُس کا ذکر کیا۔ بہت بعد میں جا کر، جب میں نے اُن کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ نسیمہ نے مجُھے بتایا کہ اُن کی ماں مری کے قریب کِسی سینیٹوریم میں تھی۔

آخری ٹرم میں صلاح الدین کمپنی کے جمیل اور جمال بھی ایک طرح سے ہمارے گروپ میں شامل ہو گئے، مگر وہ بات نہ بنی جو ہم چھ کے درمیان تھی، جنہیں ہم "دی اوریجنل سِکس" کہتے تھے۔ شعیب اور جمیل میں نمبروں کے مقابلے کی رقابت پیدا ہو گئی تھی۔ شعیب پڑھاکو ہونے کے باعث اکیڈیمک لحاظ سے آگے تھا، مگر دُوسرے شعبوں میں اُس کی دلچسپی صِرف ڈیوٹی کی حد تک تھی۔ جبکہ جمیل آل راؤنڈر تھا۔ آخر میں جمیل سورڈ آف آنر کے لِئے منتخب ہو گیا۔ ڈنر ہوئے، ہم باقاعدہ افسر بن گئے۔ وہی جے سی او،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور این سی او جو ہمیں کیڑے مکوڑے سمجھ کر پاؤں تلے روندتے تھے، ہمارا ستارہ لگنے پر دیکھتے ہی اٹن شن ہو کر سلیوٹ کرنے لگے تھے۔ ہمارا جہان ہی بدل چُکا تھا۔ سر ساتویں آسمان پہ تھا اَور پیر زمین پہ نہ ٹکتے تھے۔

"یار یہ باتیں ہوتی رہیں گی،" آصف نے متانت سے کہا، "لیکن ایک بات ہے، آرمی نے ہمیں بندہ بنا دیا ہے۔"

تمام تر سختیوں کے باوجود، اکیڈمی چھوڑنے پر ہمارے دِلوں میں گہری اُداسی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔ میں نے، برکی اَور آصف نے انفنٹری کے لِئے اپنی ترجیح پیش کی تھی، جبکہ شرفی اَور شوکت نے آرٹلری اَور شعیب نے کمیونی کیشن کا انتخاب کیا تھا۔

تین چار سال قبل اعجاز نے کھرلوں کے بیاہ کے موقعہ پر ایک اچھے سوتی کپڑے کی شیروانی سلوائی تھی جو اُس نے ایک آدھ مرتبہ ہی پہنی تھی۔ اعجاز کے خیال میں ہر اچھے موقع کے لِئے یہ ایک موزوں لباس تھا۔ مگر سکینہ اور چاچا احمد اُس سے اختلاف کر رہے تھے۔

"بڑے بڑے جرنیل کرنیل آئیں گے،" چاچا احمد کہہ رہا تھا، "پُرانی اچکن پہن کر جانا دُرست نہیں۔"

"ابا ٹھیک کہتا ہے،" سکینہ نے کہا۔ "کوئی پیسوں کی کمی ہے؟"

"سرفراز فوج کا افسر بن رہا ہے۔ تُو اُس کے باپ کی جگہ پر جا رہا ہے،" چاچے احمد نے کہا۔

"عزت کا ماملہ ہے،" سکینہ نے کہا۔ "خرچ اخراجات کی اَیسے موکوں پر پروا نہیں ہوتی۔ پیسے اَور جدادیں کِس کام کی اگر موکے محل پر خرچ نہ کی جائیں۔"

اعجاز چُپ بیٹھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سارے وڈ وڈیرے کالی اچکن پہنتے ہیں۔ اُوپر مایا والی پگ کا شملا نکال کے جا۔ سرفرازے کا سر بھی اونچا ہو گا۔ کالی اچکن بنوا لے،" چاچے احمد نے کہا۔ "پرانی مجھے دے دے۔ میرے اَور باسے کے کام آئے گی۔"

"ابا تُو تو چپ کر،" سکینہ بولی، "پہلے کالی اچکن بنے تو پُرانی کا بھی دیکھا جائے گا۔ سب سے پہلے میرا حق پورا کرے۔ پیسے بنک میں ڈالتا جاتا ہے اَور زمینیں دیکھتا رہتا ہے۔ یہ دیکھ،" وہ اپنے باپ کے آگے باہیں پھیلا کر بولی، "نہ گہنا نہ کپڑا۔ چار دفعہ کہہ چکی ہوں ایک کالا برکا ہی بنوا دے۔"

اعجاز مسکرایا۔ "اب تجھے مُنہ چھپانے کا خیال آیا ہے؟"

"مُنہ کون چھپاتا ہے،" سکینہ بولی، "نکاب تو اُلٹا ہی رہتا ہے۔ چھپنے چھپانے کی بات نہیں، عزت کی بات ہے۔ پہلے اَور مالہ تھا۔ مگر جب اللہ عزت دیتا ہے تو میساں برکا اَور نوکر لے کر گھر سے نِکلتی ہیں۔"

"اجاز،" چاچا احمد سوچ کر بولا، "تو پینٹ کوٹ پہن کر کیوں نہیں جاتا؟ فوج کا رواج ہے۔ اُوپر خاکی ٹوپ لگا لینا، ٹش نِکل آئے گی۔"

اعجاز ہنس پڑا۔ "خاکی ٹوپ کا رواج ختم ہو گیا ہے چاچا۔"

"تیرے اُوپر سج جائے گا،" چاچا سنجیدگی سے بولا، "تیرا رنگ بھی گورا ہے۔"

"کپڑوں کی طرف تو دھیان نہیں دیتا،" سکینہ نے کہا۔

"میرے کپڑوں کو کیا ہے،" اعجاز بولا، "سیدھے صاف ستھرے پہنتا ہُوں۔ بس شو، شا نہیں کرتا۔ اوچھے لوگوں کا کام ہے۔"

"شوشا کی بات نہیں،" چاچا احمد بولا۔ "سرفراز کی عزت ہے۔ تیری بھی عزت ہے۔ تیری پزیشن اب کوئی ہلکی ہے؟"

اعجاز کی حیثیت اب بہت مضبوط ہو چکی تھی۔ میوے والا گڑ ہاتھوں ہاتھ بک رہا تھا۔ ایک سال کے اَندر اِس کی کھپت مقامی منڈی کی حدود پار کر چکی تھی۔ اعجاز نے بارہ ایکڑ زمین نقد پر بیع اَور مزید بارہ ایکڑ ٹھیکے پر حاصل کر کے دُوسرے سال ساری زمین میں کماد بویا تھا۔ اپنا بیلنا خرید لیا تھا اور زمین پر دو کمروں کا ڈیرہ بنا لیا تھا جہاں گل افروز خان کے علاوہ دو. مستقل ملازم رہتے تھے اَور تازہ گُڑ و میوے کا ذخیرہ بھی ہوتا تھا۔ چاچا احمد اُسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وافر مقدار میں خشک میوے ہندوستان سے منگوا کر سپلائی کر دیتا تھا جو اُسے بازار کی نسبت کافی سستے پڑتے تھے۔ اعجاز اب اپنی منڈی کے علاوہ دُوسرے شہروں کو اپنے گڑ کی "لدان" کرتا تھا۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شجاع آباد کی شناخت "بدامی گڑ" کے حوالے سے ہوتی تھی۔ اس سے اگلے سال آمدنی اِس حد تک گئی کہ آدھا مربع زمین نقد پر بیع کرانے اَور اُوپر کا خرچہ نکالنے کے بعد بھی اعجاز کے پاس بنک میں جمع کرانے کے لِئے پیسے بچ رہے تھے۔ اِن سب باتوں کے باوجود اعجاز کا دِل اَور دماغ صحیح جگہ پہ قائم تھے، نہ دِل میں فتور آیا تھا نہ دِماغ میں غرور۔ اُس کا دِل اصل میں اپنے مزدُوروں کے درمیان ہی اٹکا رہا تھا۔ اُس کے دِل میں بیٹھی ہُوئی چند باتیں تھیں جو اُس کو لمحہ بھر کے لِئے نہ بھولتی تھیں۔

گاؤں کی مصرُوفیات کے باوجود اعجاز تقریباً ہر روز وقت نکال کر شہر جاتا اَور یونین کے کام کرتا تھا۔ وہاں پہ بھی اُسے برابر کی کامیابی حاصل ہُوئی تھی۔ مشرقی شہر اَور نواح کی چھوٹی بڑی مزدُور تنظیموں کا باہمی ربط استوار ہونے میں کافی حد تک پیش رفت ہو چکی تھی، جس کا سہرا اعجاز کے سر تھا۔ لیبر فیڈریشن کے عہدے داروں کے ساتھ اُس کا تعلق واسطہ پیدا ہو گیا تھا اور اب وہ اَندرون اَور مغربی شہر اَور شاہدرے بادامی باغ کے بڑے صنعتی علاقے تک مار کرنے کی فکر میں تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ تنظیم نے اُسے باغبان پورے کے علاقے میں ایک چھوٹا سا کمرہ مہیا کر دیا تھا، جسے وہ دفتر کے طور پر استعمال کرتا اور وہیں سے ضروری خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ اب اُسے ایک "سیٹ" میسر آ گئی تھی جسے وہ اپنی کاروباری ترقی سے بھی زیادہ بڑی کامیابی تصور کرتا تھا۔ اِن حالات نے اُس کے مزاج کے اَندر مزید لچک اَور دنیاداری کا رویہ پیدا کر دیا تھا، یہاں تک کہ دو ایک بار وہ ملک جہانگیر کے مسئلوں کے بیچ اُس کے گھر پہ جا چُکا تھا۔ مزید ڈیڑھ دو سال گزرنے کے بعد اعجاز دو مربع سے اُوپر کی اراضی کا ذاتی مالک بن چُکا تھا اور جہانگیر اب خاص طور پر اُس کی سیاسی حیثیت کے پیش نظر اعجاز کے ساتھ برابری کے درجے پہ سلوک کرنے لگا تھا۔ پھاگن میں جہانگیر کے بھتیجے کا بیاہ تھا۔ جس میں شرکت کے لِئے اُس نے اعجاز کو بمعہ "لفٹننٹ ملک سرفراز اعوان" و اہل و عیال دعوت نامہ بھیجا تھا۔

اب سکینہ نے ایک آخری وار کیا۔ "بُرکے بغیر میں جھنگیر کے گھر قدم بھی نہ رکھوں گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے،" اعجاز بولا، "برقعہ لے دوں تو جائے گی؟"

سکینہ چپ رہی۔

"اب بول ناں،" اعجاز نے کہا، "جائے گی؟"

"دیکھا جائے گا۔ پہلے برکا اور چوڑیاں تو بنیں۔"

اعجاز ہنسا۔ "اب آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہو۔ یہ چوڑیاں کدھر سے آ گئیں؟"

"اَور کیا۔ میں کب تک موکا بموکا اماں کے کپڑے مانگ کر بانہوں کو ڈھکتی رہوں؟ تُمہیں تو زمینیں خریدنے اَور ابھم مارے شہر کے بکھیڑوں سے ہی منٹ نہیں ملتا۔"

"چوڑیاں بھی آ جائیں تو پھر؟" اعجاز نے شرارت سے پوچھا۔

"پھر کیا؟"

"پھر جائے گی؟"

"پھر دیکھا جائے گا۔ جھنگیرا کوئی لاٹ صاحب ہے۔"

اعجاز ہنس پڑا۔ "بہانے بنائے جا۔ کب تک بنائے گی۔"

"یہ میرے بہانے نہیں، تُمھارے ہیں، جیب کی گانٹھ نہ کھولنے کے بہانے۔"

اعجاز دھیان ہٹا کر مُنہ ہی مُنہ میں ہنستا رہا۔ حسن چاچے احمد کے گلے میں باہیں ڈالے اُس کی پشت پہ سوار تھا۔

"اوئے حسنے،" اعجاز نے آواز دی۔ "اِدھر آ۔"

حسن چاچے کی پشت سے اُتر کر باپ کی گود میں آ بیٹھا۔ "نانے کو کیوں تنگ کرتا ہے؟" اعجاز نے کہا۔

"چاچا؟" بچے نے پوچھا۔

"چاچا میرا ہے،" اعجاز نے اُس سے کہا۔ "تیرا نانا ہے۔"

"نہیں،" بچہ بولا۔ "چاچا۔"

"اوئے تیرا نانا ہے، بے وقوف۔"

اعجاز اسی طرح پیار سے اُس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ سکینہ نے اعجاز کا دھیان بٹا ہُوا دیکھا تو چولہے میں جلتی ہُوئی لکڑی کو ہلا ہلا کر چاچے کو اپنی جانب متوجہ کیا اور ہاتھ اَور سر کے اشاروں سے اُسے اعجاز کے ساتھ بات کرنے کو کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اجاز،" چاچا احمد بولا، "جمیلہ کے رشتے کا ماملہ تھا۔ سکینہ نے بات کی ہوگی۔"

"ہاں،" اعجاز کچھ توقف سے بولا۔

"بات پکی ہو جائے تو دُرست ہے،" چاچے نے کہا، "لوگوں کی نظریں سنبھل جاتی ہیں۔"

"بات تو دُرست ہے چاچا،" اعجاز نے کہا۔

"پھر زندگی کا کیا پتا ہے۔ آج ہے، کل گئی۔ ایک یہ ذمہ داری نِکل جائے۔ تو میں آرام میں ہو جاؤں۔ تیری ماسی ہر وقت فکر کرتی ہے۔"

"درست کہتے ہو چاچا،" اعجاز سکون سے بولا، "ذمہ داری تو ہوتی ہی ہے۔"

"اُوپر سے باسے کی فکر بھی ہے۔ اُس کا دِل نہ کھیتی میں لگتا ہے نہ کسی اَور بات میں۔ میرے کام کا اُسے چسکہ پڑ گیا ہے۔ غلطی میری ہی ہے۔ اب میں کہتا ہوں پُلس وُلس میں بھرتی ہو جائے تو ٹِک جائے گا اور بچا بھی رہے گا۔ تیرا ابھی اثر رسوخ ہے، سرفراز بھی اب فوج کا افسر ہو گیا ہے۔ آج کل فوج کا راج ہے۔"

"سارے کام آہستہ آہستہ ہو جائیں گے چاچا۔ ابھی تو سرفراز پورا افسر بھی نہیں بنا،" اعجاز ہنس کر بولا۔

"واہ، فوج کے افسر کی بات کوئی موڑ نہیں سکتا۔ بس، تیری بہن کی بات پکی ہو جائے تو میری گردن سے بوجھ اُتر جائے۔"

اعجاز کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر بولا، "چاچا، جمیلہ میری بہن بھی ہے اَور بیٹی بھی، میری مرضی کی بات ہو تو آج ہی پکی کر دوں۔ مگر سرفراز اب جوان ہے، کالج کا پڑھا ہوا ہے، اپنی مرضی کا مالک ہو گیا ہے۔ ایک بار اُس سے بات کر کے دیکھ لینے دو، پھر سمجھو کہ بات پکی ہو گئی۔"

"مرضی تو جو ہو گی تیری ہو گی اجاز۔ اِن باتوں کا اقرار بڑوں میں ہی ہوتا ہے۔" چاچے احمد نے کہا، "تیرا خیال ہے کہ ہندستان سے آنے کے بعد تیرا رشتہ ہوا تھا؟ نہیں۔ سکینہ اَور تُو ابھی بچو نگڑے تھے جب تیری بہشتن ماں نے اپنی بہن سے بات کر کے تیرا منگیوا پکا کر لیا تھا۔"

سکینہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس نے تندہی سے چولہا صاف کرنا شروع کر دیا۔